

دین آسان ہے

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، قال: ان الدین یسرولن یشاد الدین احد الا غلبہ. فسددوا، وقاربوا، وابشروا. واستعینوا بالغدوة والروحة وشيء من الدجلة. (بخاری، کتاب الایمان)

”ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین آسان ہے، لیکن جو اس میں سختی برتے گا، دین اسے پچھاڑ دے گا۔ اس لیے تمہیں چاہیے کہ سیدھی راہ پر چلو، میانہ روی اختیار کرو۔ لوگوں کو انعام کی نوید بھی دو اور صبح و شام اور رات کے خوش گوار وقتوں میں اللہ کی بندگی بجالایا کرو۔“

مشکلات کا حل

یشاد الدین: دین میں سختی برتنا۔ یعنی اس پر عمل کرتے ہوئے اپنی طاقت سے تجاوز کر جانا۔
سددوا: اس سے مراد راہ راست کو اختیار کرنا ہے۔ سیدھی راہ سے مراد، ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔

قاربوا: افراط و تفریط سے بچ کر میانہ روی اختیار کرو۔

واستعینوا بالغدوة والروحة وشيء من الدجلة مراد یہ ہے کہ ان خوش گوار وقتوں سے اللہ کے ہاں قرب حاصل کرنے کے لیے مدد لو۔ غدوة: سحری سے لے کر دن نکلنے تک کے وقت کو کہتے ہیں۔ راحة: دن میں زوال کے بعد سے رات کے پوری طرح چھا جانے تک کے وقت کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور دجلة رات کے آخری

وقت کو کہتے ہیں۔ یہی اوقات ہماری نمازوں کو محیط ہیں، ہماری نمازوں کے اوقات ایک اہمیت کے حامل ہیں۔ ان اوقات میں ہماری زمین کی کائنات نمایاں تبدیلیوں سے گزرتی ہے۔

وضاحت حدیث

ان السدین یسر: دین آسان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ یہ دین اپنے سب تقاضوں کے ساتھ مشکل نہیں ہے کیونکہ اس کے تمام تقاضے ہماری فطرت کے مطابق ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ یہ دین انسان کی طاقت سے بڑھ کر کوئی حکم نہیں دیتا۔

یہ دین ہماری فطرت کے مطابق ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب ایک سلیم الفطرت آدمی اپنے ارد گرد کی چیزوں کو دیکھتا ہے تو ان نعمتوں سے اس کو ایک خالق عظیم کے کائنات کے پس پردہ موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے اوپر اس خالق کے گونا گوں احسانات پاتا ہے تو اس کا دل احسان مندی کے گراں قدر جذبے سے جھک جاتا ہے، لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھک جانے کا یہ طریقہ جو اس نے اختیار کیا ہے، صحیح بھی ہے یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں تو پھر صحیح طریقہ کیا ہے؟ یہ سوال انسان کو صحیح طریقے کی تلاش میں سرگرداں کر دیتا ہے۔ انسان کے دل میں پیدا ہونے والے اس سوال کا جواب خالق کائنات کی طرف سے دین اسلام ہے۔

یہ دین اتنا ہی آسان ہے جتنا پیاس لگنے پر پانی پی لینا۔ اپنی پیاس بجھانے کے لیے بھی ہمیں کچھ کرنا پڑتا ہے اور روح کی پیاس بجھانے کے لیے بھی ہمیں کچھ اعمال سرانجام دینا پڑتے ہیں۔ ان اعمال کا نام دین ہے۔

ہمارے وجود کے جتنے تقاضے ہیں؛ مثلاً کھانا، پینا، سونا، اور بسنا وغیرہ۔ ان سب تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہم ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں، مصیبتیں جھیلنے ہیں اور نہ جانے کتنی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ یہ سب کام خواہ کتنے ہی مشکل ہوں ہمارے لیے آسان ہوتے ہیں، اور بعض اوقات ان کو سرانجام دینے کے لیے ہم جان پر کھیل جاتے ہیں۔

ہمارے وجود کا ایک تقاضا پروردگار کا شکر ادا کرنا بھی ہے۔ اس تقاضے کو پورا کرنا بھی آدمی کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بھی وہ ہر طرح کی مصیبت مول لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو اس تقاضے کا اسی طرح احساس ہو جائے جیسے پیاس کو اپنی پیاس کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور بھوکے کو اپنی بھوک کا۔

پھر یہ بھی کہ یہ دین خود خالق کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ خالق اپنی مخلوق کی فطرت سے جس قدر واقف ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی واقف نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ حقیقت ہے کہ اس کا دیا ہوا دین مخلوق کی فطرت کے مطابق ہوگا۔ جس طرح ایک انجینئر ایک مشین بناتا ہے۔ تو وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس سے کیا کام لیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح ہم انسانوں کو بنانے والے نے ہماری مشینری کے بارے میں بتا دیا ہے کہ اس نے آدمی کو اسی دین پر چلنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ یعنی انسان کی تخلیق ہی اس دین پر چلنے کے لیے ہوئی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. (الذاریات ۵۱: ۵۶)
 ”ہم نے جن وانس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہمارے عبادت گزار بن کر رہیں۔“

گویا ایک مشین روئی بیلنے کی بنائی گئی۔ تو روئی بیلنا اس مشین کی فطرت ہے۔ مشین کی اس فطرت کے مطابق اس سے کام لینا آسان ہے۔ لیکن روئی بیلنے کے بجائے اگر ہم اس سے گندم پینے کا کام لینا شروع کر دیں تو شاید دلایا بھی ہمارے ہاتھ نہ آئے۔ بالکل اسی طرح ہمارے خالق نے اگر ہمیں اس لیے بنایا ہے کہ ہم اس کی بندگی کرتے ہوئے جئیں تو پھر یہ بات بالکل واضح ہے کہ روئی بیلنے کی مشین کی طرح ہماری فطرت کے مطابق جو کام ہے وہ دین پر چلنا ہے۔ تو جس طرح روئی بیلنے کی اس مشین کے لیے روئی بیلنا آسان ہے، اسی طرح ہمارا اس دین پر چلنا آسان ہے۔ لیکن، بہر حال یہ ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اس کو ہر آدمی پوری طرح سے نہیں اٹھا سکتا۔ اس چیز کا لازمی تقاضا ہے کہ ہر آدمی پر اس کی طاقت اور صلاحیت کے مطابق ذمہ داریاں ہوں اس لیے قرآن نے ایک اصول وضع فرما دیا کہ

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا.
 ”اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔“ (البقرہ ۲: ۲۸۶)

ہر شخص بس اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اسے طاقت عطا ہوتی ہے۔ جو چیز اس کے حدود و اختیار اور امکان سے باہر ہے۔ اس کے بارے میں اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔ ان کمزوریوں کی صورت میں، اللہ نے بندوں کو رخصتیں دی ہیں۔ یعنی روئی بیلنے کی چھوٹی مشین سے بڑی مشین جتنے کام کا تقاضا نہیں ہوگا۔ اوپر کی بحث سے یہ معلوم ہوا کہ پورے کا پورا دین ہماری بشری کمزوریوں، قوتوں اور صلاحیتوں کو مد نظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔ اور چونکہ تمام لوگ ایک طرح کی صلاحیتیں نہیں رکھتے اس لیے ان کی سہولت کے لیے رخصتیں ہیں تاکہ دین آسان رہے۔ اب ہم حدیث کے دوسرے جملے کو لیتے ہیں۔

ولن يشاد الدين احد الا غلبه:

اس سے مراد یہ ہے کہ دین آسان ہے، لیکن جس نے اس کو مشکل بنایا اور اس کو سر لینے کی کوشش کی اس کا انجام یہ

ہوگا کہ دین اس کو شکست دے دے گا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ

عن عبد اللہ بن عمر، قال: قال لی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم: الم اخبر، انک تقوم اللیل و تصوم النهار. قلت انی افعل ذلک، قال: فانک اذا فعلت ذلک هجمت عینک و نفهت نفسک. و ان لنفسک حق و لاهلک حق. فصم و افطر و قم و نم. (بخاری، کتاب التہجد)

”عبداللہ بن عمر کہتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سمجھتے ہو کہ مجھے خبر نہیں ہوتی حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تم رات بھر قیام کرتے ہو اور دن میں روزہ رکھتے ہو۔ تو عبداللہ بن عمر نے کہا: ہاں میں ایسا کرتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا: تم ایسا کرتے ہو تو یاد رکھو کہ تمہاری آنکھیں اندر دھنس جائیں گی جسم کمزور ہو جائے گا جبکہ تمہیں خیال رکھنا چاہیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔ اور تمہارے گھر والوں کا بھی۔ اس لیے روزے رکھو تو وقفہ بھی کرو۔“

جسم کے حقوق ادا نہ کرنے سے جو نتیجہ نکلے گا اس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے کہ آنکھیں اندر دھنس جائیں گی اور جسم کمزور پڑ جائے گا۔ اس کمزوری اور لاغری سے، وہ آدمی جو قیام و صیام میں صبح و شام مشغول رہتا تھا، ہو سکتا ہے کہ پھر رمضان کے روزے رکھنے کے بھی قابل نہ رہے۔ اور وہ جو رات بھر قیام کیا کرتا تھا ہو سکتا ہے کہ پھر فرض نمازوں کا ادا کرنا بھی اس کے لیے مشکل ٹھیرے۔ جو آدمی اس طریقے کو اختیار کرتا ہے، اس کا حال اس شخص کا سا ہے، جس نے سونے کے انڈے حاصل کرنے کے لیے مرغی ذبح کر دی ہو، اور پھر مرغی سے بھی محروم ہو گیا ہو۔ ایسے اعمال دنیا والوں کی نظر میں بھی احمقانہ ہوتے ہیں اور خدا کے ہاں بھی کچھ زیادہ اجر نہیں رکھتے۔ کیونکہ ایسا کرنے والوں کا اپنے عمل پر دوام بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی دل کی حضوری ہوتی ہے، جبکہ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہوتا ہے۔ جس پر آدمی کا ہمیشہ عمل رہے۔ خواہ یہ عمل کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ

ای العمل احب الی اللہ قال: ادومہ و ان قل. (بخاری، کتاب الایمان)

”کون سا عمل اللہ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ آپ نے فرمایا: وہ کام جو ہمیشہ عمل میں رہے۔“

خواہ وہ عمل کتنا ہی حقیر ہو۔“

اعمال میں شدت ویسے بھی آدمی کو بے زار کر دیتی ہے۔ اس بے زاری میں خود عمل کرنے والا بھی دل میں تنگی محسوس کرتا ہے جس سے ان نیکیوں کے اکارت چلے جانے کا احتمال ہوتا ہے جن کو اس نے بڑی محنت سے کیا ہوتا ہے۔ اور دوسروں کے حقوق بھی غصب ہوتے ہیں۔ اللہ کے ہاں یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ ایک حق کو پورا کرنے میں آدمی اس قدر لگ جائے کہ اس کے دوسرے بیسیوں حقوق ادا ہونے سے رہ جائیں۔ اللہ کے ہاں تو یہ بات پسندیدہ ہے کہ ایک وقت میں بندے پر جتنے حقوق ہیں وہ سب کے سب پورے ہوں اور ہمیشہ پورے ہوتے رہیں۔ یہ نہیں کہ ماں باپ تو گھر میں اس کی مدد کو ترستے رہیں اور وہ مسجد کے کسی کونے میں اپنے تئیں نیکیاں کما رہا ہو۔ یہ دین نہیں بے دینی ہے۔ آدمی پر اس کے گھر کے، اس کی ریاست کے، اس کے ہم سایوں کے اور خود اس کے اپنے نفس کے حقوق ہیں جن کو پوری ذمہ داری سے ادا کرنا چاہیے اور ان کے ساتھ ساتھ اللہ کے حقوق بھی پوری طرح ادا ہونے چاہئیں۔

فسد دوا و قاربوا و ابشروا:

ان تمام حقوق کو جو ریاست، معاشرے اور گھر کی طرف سے فرد پر عائد ہوتے ہیں پوری طرح سے ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جائے اور افراط و تفریط سے بچ کر میانہ روی اختیار کی جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ عمل کیا جائے جو آدمی کی طاقت میں ہو اور جس پر وہ آسانی کے ساتھ ہمیشہ عمل کر سکے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ کوئی حکم لوگوں کی استطاعت سے بڑھ کر نہ ہو۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ

”جب آپ لوگوں کو کوئی حکم دیتے تو اس بات کا حکم دیتے جس کی لوگ استطاعت رکھتے ہوں۔ ایک مرتبہ لوگوں نے آپ سے کہا (ہمیں کچھ اور بھی بتائیے) کیوں کہ ہمارا معاملہ آپ سنا نہیں ہے آپ کی تو تمام اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی گئیں ہیں۔ (ہمیں تو زیادہ عمل کرنے کی ضرورت ہے) اس پر آپ کو غصہ آگیا۔ غصہ اتنا آیا کہ آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پھر کہا: (تم مجھ سے زیادہ متقی بنتے

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اذا امرهم، امرهم من الاعمال بما يطيقون قالوا: انا لسنا كهئيتك يا رسول الله. ان الله قد غفر لك ما تقدم ذنبك وما تاخر. فيغضب، حتى يعرف الغضب في وجهه. ثم يقول: ان اتقاكم واعلمكم بالله انا.

(بخاری، کتاب الایمان)

ہو؟) میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا اور اس کو جانتا
ہوں (مجھ سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو میری پیروی
کرو)۔“

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کسی انسان کی تقویٰ اور نیکی میں آخری حد ہے۔ اس سے آگے جو کچھ
ہے وہ بے دینی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے۔

واللہ انی لا خشاکم للہ و اتقاکم لہ .
ولکنی اصوم و افطر . و اصلی و ارقد
اتزوج النساء فممن رغب عن سنتی ،
فلیس منی . (بخاری، کتاب النکاح)

”خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا
ہوں، اور میں سب سے زیادہ اس کے غضب سے بچنا
چاہتا ہوں۔ لیکن میں (عام دنوں میں) روزے بھی
رکھتا ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں۔ میں رات میں قیام
بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ نکاح بھی کرتا ہوں
(یہی میرا طریقہ ہے) جس نے اس طریقے کو چھوڑا
وہ میرا امتی نہیں ہے۔“

اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فسددوا، اور قاربوا، یہ محکم راستہ ظاہر ہے کہ آپ
صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہی ہے۔ اور قاربوا، اس پر مزید تاکید فرمائی کہ میرے طریقے کے قریب آؤ۔ نہ اس
میں اضافہ کرو اور نہ اس میں کمی کرو۔

ابشروا: بھی ایک ایسا حکم ہے جیسا فسددوا، اور قاربوا، ہیں۔ اس میں دین کی طرف دعوت دینے والوں
کے لیے حکم ہے کہ وہ لوگوں کو صرف دوزخ سے ڈرائیں ہی نہیں، بلکہ ان کو جنت اور اس کی نعمتوں کی بشارت بھی
دیں۔ یہ نہ ہو کہ لوگ دین کو ڈرانے والے کی چیخیں سمجھ کر اس سے بھاگ جائیں۔ بلکہ انعام پانے کی نوید سن کر دین
کی طرف لپکیں۔ کیونکہ انعام پانے کی خواہش بھی انسان کی فطرت ہے۔ اور انسان کی ہر فطرت کا اس پر حق ہے۔
اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ دین کی دعوت صرف بشارتیں بن کر ہی نہ رہ جائے، بلکہ اس میں انذار بھی ہو اور تبشیر
بھی تاکہ لوگوں کی زندگی خوف ورجاء میں گزرے۔ خوف برائی سے روکتا ہے اور رجاء نیکی پر ابھارتی ہے۔ اگر ان
دونوں میں سے کسی ایک کا فقدان ہو تو معاملہ بگڑ جاتا ہے۔

دین پر عمل کرنے میں اصل چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہی
اصل میں وہ طریقہ ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں صراط مستقیم کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو پانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

اس کے سوا کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے جس سے خدا تک پہنچا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ خود قرآن میں فرماتے ہیں: انسی علی صراط مستقیم، میں تو بس سیدھے راستے پر ہوں، یعنی سیدھے اور آسان راستے پر۔ اللہ تعالیٰ کو پانے کے لیے کوئی پا پڑ بیلینے نہیں پڑتے، وہ تو ہر اس جگہ مل جاتا ہے، جہاں آدمی اس کی طرف رخ سیدھا کر لے۔

واستعينوا بالغدوة والروحة وشیء من الدجلة:

اس خوب صورت جملے کو اگر ہم تمثیل کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ آپ نے پورے دین پر عمل کرنے کی حالت کی اس جملے میں تصویر کھینچ دی ہے کہ اس مسافر کی طرح دین پر عمل کرو، جو اپنے سفر کا آغاز صبح سویرے کرتا ہے پھر دھوپ کی تلخی دیکھ کر ذرا رک جاتا ہے۔ پھر سورج ڈھلنے پر چل پڑتا ہے، رات کو آرام کرنے کے لیے پھر ٹھہر جاتا ہے۔ صبح تڑکے ہی پھر اٹھ کر منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

مومن بھی ایک مسافر ہے۔ اسے بھی صبح و شام اپنا سفر اسی مسافر کی طرح جاری رکھنا ہے، کچھ چل لے تو کچھ دیر کے لیے سستا بھی لے۔ عام دنوں کے روزے رکھے تو کچھ دن وقفہ بھی کر لے، رات کو قیام کرے تو کچھ دیر سو بھی لے تاکہ جب بھی وہ دوسرا کام شروع کرے تو وہ تازہ دم ہو اور پوری دل جمعی سے وہ کام کر سکے۔

خلاصہ بحث

ہمارا دین آسان ہے کیوں کہ یہ ہماری فطرت کے مطابق ہے۔ اور یہ کسی آدمی پر اس کی طاقت اور صلاحیت سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ دین پر چلنے کا صحیح طریقہ وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے۔ یہ طریقہ میانہ روی اور توازن پر مبنی ہے۔ اس میں جو اضافہ کر کے سختی کرنا چاہے گا دین اسے ایسی شکست دے گا کہ اسے دین دنیا سے بھگا دے گا۔ وہ شیطان کے چنگل میں ایسا پھنسے گا کہ پھر وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی نہیں ہو سکتا۔ آدمی کو اس انجام سے بچانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس کی تاکید کی ہے کہ میرے طریقے کی پیروی کرو۔ اسی طریقے کے قریب رہو۔ دین کی دعوت دو تو جب بھی ضروری ہے کہ میری طرح اپنی دعوت میں انذار و تبشیر کے پہلو سے بھی ایک توازن رکھو۔

اس توازن کو اس مسافر کے سفر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، جو صبح سویرے سفر شروع کرے، پھر دھوپ میں تلخی محسوس کرے تو رک جائے، دن ڈھلے تو پھر چل پڑے، رات آئے تو سو جائے اور صبح پھر منہ اندھیرے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔

اور جو شخص اس توازن کو بگاڑے، یہ بگاڑ خواہ کمی کی صورت میں ہو یا اضافے کی صورت میں، دونوں میں اس کے لیے رسوائی ہے۔ جو دین میں اضافہ کرے اس کے لیے بھی اور جو کمی کرے اس کے لیے بھی۔ کامیاب صرف وہی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی۔ اتباع سے مراد یہ ہے کہ کسی کی انگلی پکڑ کر اس کے پیچھے پیچھے چلا جائے۔ جہاں وہ رک جائے وہیں رک جانا۔ جہاں سے وہ مڑ جائے وہیں مڑ جانا۔ قرآن میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ. (آل عمران ۳: ۳۱)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com